Date of Publication : 23-07-2014
PRICE Rs. 2/-
POSTED ON 24-25 July 2014
R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 August 2014
Issue: 29, Vol.:73

یکم تا ۷ راگست ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۲۹، جلد نمبر: ۷۳

آوازِ خلق کو.....

انجمن ترقی اردو کی تاریخ میں نئے ابواب کا اضافہ

شاہنواز احمد صدیقی

انجمن ترقی اردو ایک ممتاز ادارہ ہے جو اردو زبان اور ادب کے فروغ اور ترقی کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ اس ادارے نے بدترین اور پرآشوب ماحول میں اردو زبان و ادب کی ترقی اور توسیع میں اہم کردار ادا کیا، اردو کی تحریک کو فرقہ واریت اور تنگ نظری کی سیاست سے پاک رکھتے ہوئے کاروانِ اردو کو یک جہتی کی روایات سے ہم آہنگ کیا۔ آج انجمن ترقی اردو ترقی اور توسیع کے نئے دور کی طرف گامزن ہے جس کا کریڈٹ انجمن کے صدر صدیق الرحمن قدوائی کی بزرگانہ قیادت اور جواں سال جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کی روشن خیال اور متحرک شخصیت کو جاتا ہے۔

اطہر فاروقی نے اپنی ڈیڑھ برس کی مدت میں انجمن کا نقشہ اندر ہی نہیں باہر سے بھی بدل دیا ہے۔ ان کے پیش رو ڈاکٹر خلیق انجم جنھوں نے انجمن کو دہلی میں دوبارہ بحال کیا، تقسیم کے بعد تقریباً بے حال انجمن ایک مرتبہ پھر سر اٹھانے کے قابل ہوئی، دوڑنے والے تھے اسی لیے انجمن کے طریقِ کار کے ہر زاویے پر دہلی مرحوم کے طرز کو شناخت کیا جا سکتا تھا۔ مولوی عبدالحق کے طرز پر خلیق انجم نے بہت سے علمی کام کیے جیسا خطوطِ غالب کو پانچ جلدوں میں مدون کرنا ان کے بہت سے علمی کارناموں میں سے ایک ہے۔

گزشتہ پندرہ برسوں میں انجمن کا ملک بھر میں پھیلی ہوئی اپنی ہی شاخوں سے رشتہ تقریباً منقطع ہوگیا اور اردو تحریک جو آزاد ہندستان میں انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ تھی، داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی۔ 1947 میں مولوی عبدالحق کے پاکستان جانے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے اردو تحریک شروع کی جس میں اردو کو یوپی کی علاقائی زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ کرنے کی غرض سے ایک دستخطی مہم شروع کی گئی جس میں نہ صرف تقریباً 22 لاکھ دستخط جمع ہوئے بلکہ ملک بھر میں انجمن کا تنظیمی نظام ان رضاکاروں کے ذریعے بن گیا جنھوں نے یہ دستخط جمع کیے تھے۔ اس مہم کے نتیجے میں ملک بھر میں انجمن کی 650 شاخیں قائم ہوئیں اور مختلف لوگوں نے انجمن کو بڑے بڑے عطیات دیے۔ بدقسمتی سے شاندار وراثت کو سنبھالا نہ جا سکا اور آہستہ آہستہ شاخوں کا رابطہ مرکزی دفتر سے منقطع ہوگیا اور انجمن کی املاک پر غاصبانہ قبضے کر لیے گئے۔

بہرکیف انجمن میں آج خوش گوار تبدیلی دکھائی دے رہی ہے۔ اردو گھر کی راہ داری میں دونوں طرف گملوں میں مزین طرح طرح کے پھولوں سے آراستہ قطار در قطار نہایت ہی خوش گوار تاثر دیتے ہیں۔ دوسری منزل میں انجمن کا دفتر کا ماحول بھی بالکل ہی مختلف ہے۔ ہر طرف خاموشی سے اپنے کام میں منہمک انجمن کے کارکنان کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئے نظام نے انھیں کام کرنے کے لیے نہایت ہی سازگار ماحول فراہم کیا ہے۔ جنرل سکریٹری کا کمرہ کم سے کم فرنیچر کے ساتھ کسی بہت اچھے Interior Decorator کے کمالِ ہنر کا نمونہ معلوم ہوتا ہے جسے اس طرح مزین کیا گیا ہے کہ ہر طرف سادگی کی اجارہ داری ہے اور اس کمرے میں علمی کام کے ساتھ انتظامی کام کرنے کے لیے بھی فضا بہت سازگار ہے۔ اطہر فاروقی بتاتے ہیں کہ وہ دفتر میں انجمن کے انتظامی امور کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتے۔ ان کا اپنا ایک دفتر سکھ دیو وہار میں ہے جہاں وہ انجمن سے جانے کے بعد شام کو علمی کام کرتے ہیں۔

جنرل سکریٹری کے کمرے کے ایک کونے میں مولوی عبدالحق کی وہ کرسی شیشے کے بکس میں محفوظ کر کے رکھی گئی ہے جس پر آزادی سے پہلے وہ دہلی میں انجمن کے دفتر میں فروکش ہوتے تھے۔ اس کے برابر میں ایک چھوٹے اسٹول پر مولوی صاحب کا وہ مٹی کے تیل کا لیمپ رکھا ہوا ہے جس کی روشنی میں وہ بیٹھ کر کام کرتے تھے۔

اطہر فاروقی صاحب کو اردو کی ہر روایت کا پاس ہی نہیں ہے بلکہ ان کا ذوق بھی نہایت شائستہ ہے۔ اردو کی روایت کی عظمت کا احساس، اسے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا جذبہ انجمن کے جنرل سکریٹری کے طور پر اطہر فاروقی کے ہر رویے میں بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اطہر فاروقی کا کام کرنے کا طریقہ بھی بہت مختلف ہے۔ وہ جدید تکنیک اور موزوں ذرائع ابلاغ اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اردو اداروں کے سربراہوں کی طرح کسی قسم کی بے جا پُراسراریت ان میں ہے ہی نہیں۔ نئی نسل ان کو قابلِ تقلید شخصیت کے طور پر دیکھ سکتی ہے۔

انجمن کا رسالہ 'اردو ادب' نئی آب و تاب کے ساتھ اسلم پرویز صاحب کی ادارت میں نکل رہا ہے اور 75 سال پرانے 'ہماری زبان' میں پورے ہندستان کی اردو سے متعلق خبریں ایک ہی جگہ ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اسلم پرویز صاحب کا کمرہ جو چار برس پہلے کاتبوں کے زمانے کی اردو صحافت کے مدیر کا کمرہ معلوم ہوتا تھا، اب کسی کارپوریٹ ہاؤس کے اخبار کے ایڈیٹر کے کمرے میں تبدیل ہوگیا جو بدلتے ماحول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اطہر فاروقی کے سامنے بہت

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام 'ہندستان کی مشترکہ تہذیب کا تاریخی پس منظر اور اردو ادب' کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ (۷ تا ۹ مارچ ۲۰۱۴) بین الاقوامی سمینار کے ایک اجلاس کا منظر



تصویر میں (دائیں سے بائیں) سینٹ اسٹیفن کالج میں انگریزی کے پروفیسر مِتھلے این پی، مشہور اداکار ٹوم آلٹر اور ورجینیا یونیورسٹی، امریکہ میں اردو کی پروفیسر گیتا پٹیل

سے منسلک تھے۔ انجمن میں بہت سے کرایے دار ہیں جو پرانے زمانے کے ہیں جن سے قبضہ آسان نہیں کہ وہ کم کرایے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کرایے دار نے کرایہ نہ بڑھانے اور خالی کرنے کے مطالبے پر کروڑوں روپے کا دعوا انجمن پر کردیا۔ یہ فاروقی صاحب کے انجمن میں آنے کے فوراً بعد کا واقعہ ہے مگر بالآخر انھوں نے اس کرایے دار سے ایک پورا فلور خالی کرالیا۔ دوسرے کرایے داروں کے ساتھ عجیب وغریب طرح کے کرایے نامے ہیں۔ ایک طرف جن سے قبضہ کرانا ہے تو دوسری طرف مختلف Civil ایجنسیوں سے چل رہے مقدمات اطہر فاروقی کو وراثت میں ملے ہیں جو انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر متمکن شخص کے لیے کانٹوں کے تاج سے کم نہیں۔ اطہر فاروقی نے نہ صرف انتظامی سطح کے چیلنج کو خوش اسلوبی سے قبول کیا بلکہ انجمن کو فعال اور متحرک بنانے کے لیے بھی وہ سرگرم ہوگئے جس کے لیے انھیں اب تک بہت کم وقت ملا۔ لیکن اب نئی شاخوں کا قیام، حکومت کی سطح پر اردو کے مسائل کو اٹھانے کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ حال ہی میں الہ آباد اور اوڑیسہ میں انجمن کی شاخوں کا قیام قابل ذکر ہے جسے انجمن کی تاریخ کے نئے باب سے عبارت کیا جاسکتا ہے۔

انجمن کی علمی سرگرمیوں نے بھی ایک دم رفتار پکڑی ہے۔ اپنے ڈیڑھ برس کے عرصے میں اطہر فاروقی نے داراشکوہ اور اردو کی مشترکہ روایت پر نہایت کامیاب سیمینار کرائے جس کے لیے شاید پہلی مرتبہ کسی اردو ادارے کو انڈین کاؤنسل آف ہسٹوریکل ریسرچ (ICHR) نے مالی تعاون دیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی ان دونوں سیمینار کے ذیل میں بہت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور مالی معاونت بھی کی۔

اس سطح کے علمی سیمینار بلاشبہ ساہتیہ اکادمی کے علاوہ اردو کا کوئی ادارہ ابھی نہیں کراسکا ہے۔ دونوں ہی سیمیناروں میں مغربی دانش گاہوں میں برسر کار مفکرین کے ساتھ ہندوستان کے معتبر اردو دانش وروں، مورخین نیز سوشل سائنس کے ماہرین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ بلاشبہ اردو کے کسی ادارے میں سیتا رام یچوری جیسے فرد کا بطور سامع شریک ہونا خوشگوار تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے۔ گزشتہ برس داراشکوہ سیمینار میں افتتاحی خطبہ مہاتما گاندھی کے پوتے گوپال کرشن گاندھی نے نہایت ہی تکنیکی انداز میں داراشکوہ کے نام لکھے گئے ایک ای میل نما مضمون کی شکل میں دیا تو اس برس سیمینار میں بین الاقوامی شہرت یافتہ مورخ اور سعادت حسن منٹو کی بھانجی عائشہ جلال نے اردو ہندی تنازعے کے پس منظر میں اردو کے روشن مستقبل کے لیے بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے میں قابل عمل خطوط کا تعین کیا۔

(بشکریہ راشٹریہ سہارا، دہلی، ۲۹ جون ۲۰۱۳ء)

●●●

دوسری اور آخری قسط

اقبال اور الٰہ آباد

پروفیسر علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد (یوپی)

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو دن میں گیارہ بجے دوازدہ منزل میں اس تاریخی جلسے کا آغاز ہوا۔ علامہ، نواب یوسف کی موٹر سے جلسہ گاہ تک پہنچے۔ جلسہ گاہ یعنی دوازدہ منزل جہاں باقاعدہ کوئی ہال نہ تھا بس ایک صحن تھا جس کو گھیر گھار کر جلسہ گاہ کی شکل دے دی گئی تھی، جس میں بہت زیادہ گنجائش نہ تھی۔ ندیم شفیق ملک نے اس موقعے کی تصویر یوں پیش کی ہے:

''ابتدا میں حاضرین کی تعداد مایوس کن حد تک کم تھی اور نصف کرسیاں خالی تھیں۔ حاضرین میں بڑی تعداد ایسے حضرات کی تھی جو انگریزی سے نابلد ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت سے عاری تھے اور جلسے کو مشاعرہ سمجھ کر علامہ اقبال کے کلام سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ شہر کے عمائدین اور دانشوروں میں سے بھی چند ہی موجود تھے البتہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے مسلم ہاسٹل کے مکینوں کا ایک گروہ اپنے روحانی قائد کی تقریر سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا اور علامہ اقبال بھی اپنے خطبے کے دوران زیادہ تر انھی نوجوانوں کی طرف متوجہ رہے۔''

آنکھوں دیکھا حال کا احمد الدین مارہروی اپنی رپورٹ میں یوں نقشہ پیش کرتے ہیں:

''اول تو ہال میں گنجائش ہی کتنی تھی، اس پر بھی نصف کرسیاں خالی پڑی ہوئی زبان حال سے قوم کی بے حسی کا شکوہ کرتی نظر آتی تھیں۔ دو قطاروں پر کچھ جبہ پوش حضرات قابض تھے جن کے متعلق وثوق سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ نہ انگریزی کا ایک لفظ جانتے ہیں نہ ان میں سیاسی مسائل سمجھنے کی اہلیت ہے... شہر میں عمائدین اور دانشور اول تو تھے ہی بہت کم اور جو تھے ان میں سے بھی خال خال ہی نظر آرہے تھے۔ لے دے کر مسلم ہاسٹل کے طلبہ کی ایک ٹولی تھی اور وہی غالباً اس صورت حال کی وجہ سے سب سے زیادہ مایوسی کا شکار تھی۔''

مختار زمن نے جب ۱۹۷۷ء میں مفتی فخرالاسلام سے ملاقات کی اور اس جلسے کے بارے میں پوچھا تو مفتی صاحب نے بتایا کہ

''علامہ اقبال نواب یوسف کی موٹر پر ان کے ساتھ ہی دوازدہ منزل تشریف لائے۔ اس جلسے میں مشکل سے چار سو یا پانچ سو آدمی موجود تھے۔ عبدالحئی کہتے ہیں کہ شاید اس سے بھی کم رہے ہوں گے۔ ان میں بہت سے اسکول کے لڑکے بھی شامل تھے جو شاید تفریحاً شریک جلسہ ہوگئے۔''

اجلاس کی کارروائی کا آغاز سید محمد حسین صدر مجلس استقبالیہ کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ اس کے بعد علامہ نے اپنے خطبے کا آغاز کیا۔ ستم یہ ہوا کہ ایک طرف تو جلسے کا مزاج علامہ کے شایان شان نہ تھا دوسرے خطبہ انگریزی میں تھا، جس کی کاپیاں سامعین میں تقسیم کردی گئی تھیں۔ سامعین اس کاپی کو الٹتے پلٹتے رہے۔ ندیم شفیق ملک لکھتے ہیں:

''یہ خطبہ انگریزی میں تھا اور اس کی چھپی ہوئی کاپیاں بھی حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ کچھ لوگ تو سرسری اس کا ادراک نہ کرسکے اور جلد ہی ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ نے اس کا بغور مطالعہ کرنے کی کوشش کی مگر تقریب کے اختتام تک پہلے ہی صفحے تک پہنچ پائے۔ بعضوں نے ابتدائی صفحات پڑھ کر کسی ادبی شاہ پارے کا اختتام معلوم کرنے کے سے انداز میں فوراً آخری صفحات کھول لیے۔''

احمد الدین مارہروی لکھتے ہیں:

''اجتماع میں موجودہ طالب علموں کے علاوہ بہ مشکل پچیس تیس اشخاص ایسے ہوں گے جنھوں نے علامہ کی صدارتی تقریر کے ساتھ ساتھ خطبے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس میں پنہاں اشاروں اور باریکیوں کو پہنچ پائے۔ عمومی طور پر پوری مجلس پر ایک مبہم سا سکوت اور بے لطف خاموشی چھائی رہی، جس کو اسٹیج پر سے بجائی جانے والی تالیوں کی آواز کبھی کبھی توڑتی رہی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ حاضرین کی اکثریت علامہ اقبال کی فکری بلندی اور نکتہ رسی کے ادراک سے قاصر ہے۔ چناں چہ وہ اہم نکات کی تشریح کے وقت طلبہ کی جماعت ہی کی طرف متوجہ رہے۔''

ایک جگہ اور وہ لکھتے ہیں:

''شاعر کی آنکھ بڑی تیز ہوتی ہے۔ علامہ نے ایک ہی نظر میں صورت حال کا جائزہ لے لیا۔ حاضرین کی تعداد دیکھ کر مایوسی کا ہلکا سا سایہ ان کے چہرے پر نمایاں ہوا لیکن نوجوان طالب علموں کی ایک جماعت دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا۔ خود ستائی کہیے یا احساس برتری، ہمارا خیال ہے خطبۂ صدارت پڑھنے کے دوران کسی اہم نکتے پر وہ ہماری طرف ضرور متوجہ ہوتے تھے اور ہمارا احتقا بھی ان کا ایک ایک لفظ لکھنے میں مصروف تھا۔ علامہ خطبہ پڑھتے جاتے اور جگہ جگہ رک کر کبھی کسی تشریحی جملے سے، کبھی کلام پاک کی آیت اور کبھی حدیث سے مطالب کی وضاحت فرماتے جاتے تھے... میرے سامنے کی نشست پر ایک بیرسٹر صاحب بیٹھے دیر سے پہلو بدل رہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا تو مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے 'It is all greek to me' (میرے لیے یہ سب ناقابل فہم ہے) حسن اتفاق دیکھیے کہ اسی وقت علامہ نے خطبے سے یہ فقرہ پڑھا: ''مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس علمی بحث کے لیے معاف فرمادیں گے'' اس پر بیرسٹر صاحب ایسے خاموش ہوئے کہ آخر تک لبوں پر مہر خاموشی لگی رہی۔ ظاہر ہے کہ جب پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال تھا تو دوسروں کی کیا کیفیت ہوگی''۔

اس جلسے کے چند اہم لوگ اور معزز من

شہر جن کے نام کئی مضامین میں پائے گئے، یکجا یوں ہے: غضنفر اللہ، نواب محمد یوسف، مفتی فخرالاسلام، عبدالحی عباسی، احمد الدین مارہروی، رحم علی الہاشمی اڈیٹر ہفتہ وار اسٹار، سید محمد حسین بار ایٹ لا، بیرسٹر ظہور احمد، ڈاکٹر ایم یو جنگ اور شیخ رحیم بخش وغیرہ اس جلسے میں شریک تھے۔ شہر سے باہر کے جو معتقد حضرات تشریف لائے ان کے نام یہ ہیں: مولوی محمد یعقوب (مرادآباد)، نواب محمد اسماعیل خاں (میرٹھ)، حسین امام (گیا)، سید حبیب شاہ (لاہور)، سر عبدالقادر (لاہور)، سیٹھ عبداللہ ہارون (کراچی)، حفیظ الرحمٰن، محمد عظیم (غازی پور)، مولوی عبدالمجید سندھی (حیدرآباد سندھ)، مولوی عبدالقادر قصوری (لاہور)، سید ذاکر علی (لکھنؤ)، مولانا عبدالماجد (بدایوں)، سیٹھ طیب علی (کراچی)، مولوی علاء الدین (میرٹھ)، مولانا عبدالخبیر (غازی پور)، خان بہادر برکت اللہ (غازی پور)، شاہ نذیر حسین ایم ایل سی (بہار)، مولوی عبدالکافی (کانپور)، مولوی عبدالصمد (بدایوں)، اظہر علی (لکھنؤ) وغیرہ۔ (بہ حوالہ مضمون ندیم شفیق ملک، فہرست تشکیل کی سید شریف الدین پیرزادہ نے، جنھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ڈاکومینٹس کی جلدوں میں تیار کیے۔ یہ فہرست جلد دوم کے ص ۱۵۳ پر ملتی ہے)۔

یہ معدودے چند معززین اور کچھ ذہین طلبہ نے جلسے کی آبرو رکھ لی ورنہ زیادہ تر لوگ علامہ کو دیکھنے یا بطور شاعر سننے کے لیے آئے تھے جس کا احساس علامہ کو بھی ہو چکا تھا، پھر بھی وہ خطبہ پڑھتے گئے۔ خطبہ انگریزی میں ہونے اور علامہ کی غیر معمولی قد آور شخصیت ہونے کی وجہ سے مجمعے پر ایک احترام و عدم افہام سے پُر ایک سکوت سا طاری تھا۔ علامہ خطبہ پڑھتے جاتے اور رک رک کر کسی خاص نکتے کی تشریح بھی کرتے جاتے۔ قرآن مجید اور احادیث کے اشاروں کی وضاحت بھی کرتے جاتے۔ اسلام اور عیسائیت کے مابین نظامِ کائنات، اخلاق و اقدار کے واضح فرق کو بھی بتلاتے جاتے۔ یہ بھی کہا کہ اسلام میں روحانیت کے لیے ترکِ دنیا ہرگز ضروری نہیں لیکن اس کے برعکس مغرب میں مادیت اور روحانیت دو مختلف عناصر کے طور پر لیے جاتے ہیں۔ علامہ اس نوع کی عالمانہ گفتگو کرتے ہوئے اکبر اور کبیر کا ذکر کرتے گئے اور فرمایا کہ ان لوگوں نے ہندو و مسلم اتحاد کی جو کوششیں کیں، وہ قابل تعریف ہیں تو مجمعے سے نعرۂ تکبیر کی صدا بلند ہوئی تو علامہ کو قدرے ناگوار گزرا۔ احمد الدین مارہروی نے لکھا ہے:

"علامہ کی تیوری پر بل پڑ گئے، کچھ وقفے کے لیے رکے اور خطبے کو میز پر رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی ہوگی کہ حاضرین کی اکثریت ان کے خیالات کو سمجھنے کی اہل نہیں"۔

اور آگے احمد الدین لکھتے ہیں:

"جب اس فقرے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کے اندر ایک اسلامی سلطنت قائم کرنے کا مطالبہ حق بہ جانب ہے تو ایک لمحے کے لیے رکے کہ انھوں نے تشریحاً ایک عجیب سیاسی اصطلاح استعمال کی جو اس سے قبل ہم نے کبھی نہ سنی تھی۔ انھوں نے فرمایا "By this I mean_An Imperiam in Imperis" ہماری زبان سے بے ساختہ "سبحان اللہ" نکلا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ علامہ کا چہرہ دمک اٹھا اور گردن کے اشارے سے انھوں نے یہ داد قبول کی"۔

میں اس مضمون میں اسلامی سلطنت یا ریاست، وجود پاکستان یا تصور پاکستان وغیرہ کے بارے میں زیادہ کچھ عرض نہ کروں گا۔ یہاں صرف اس جلسے کی روداد اور حالات پیش کرنا مقصود ہے۔ البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ علامہ نے مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کے بارے میں کچھ ایسی دانشورانہ اور دردمندانہ باتیں سوچی تھیں جو اس وقت کے بڑے سے بڑے بیرسٹر اور مسلم لیگی لیڈران بھی نہ سوچ سکتے تھے لیکن افسوس کہ اسی جلسہ گاہ میں علامہ کی اس نکتہ رسی اور دور اندیشی کی خاطر خواہ داد نہ مل سکی، جس کا احساس تو خود علامہ کو بھی ہوا اور علامہ نے اپنے خطبے کو 'سورۂ مائدہ' کی اس آیت پر ختم کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ: "مسلمانو اپنی حفاظت خود کرو۔ جب تک تم سیدھے راستے پر ہو کوئی گمراہ تم کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا"۔

یہ ضرور تھا کہ خطبے کے خاتمے تک جلسہ گاہ بھر چکی تھی اور لوگ دائیں بائیں بھی کھڑے تھے لیکن ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو علامہ کو شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے اور ان کا کلام سننے کے لیے بے چین و بے قرار تھے چناں چہ وہی ہوا کہ علامہ خطبہ ختم کر کے ابھی اپنی نشست پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ حاضرین کی طرف سے فرمائش ہونے لگی کہ "غزل سنائیے — غزل سنائیے!" علامہ، جن پر جلسے کی مایوس کن صورت حال کا خاصا اثر تھا اور خطبے میں جس نوع کی سنجیدہ اور مفکرانہ گفتگو کی گئی تھی اس کے پیش نظر وہ شعر و شاعری کے لیے ہرگز تیار نہ تھے لیکن جب بہت اصرار ہوا تو بادلِ نخواستہ دھیمی سی آواز میں چند ایسے اشعار سنا دیے جن کا تعلق 'فلسفۂ خودی' سے تھا، جس سے مجمع مطمئن نہ ہو سکا چناں چہ مجمع پھر اصرار کرنے لگا۔ اس بار علامہ نے نہایت عاجزی سے کہا "آپ میں ایک حدیث سناؤں گا اور اگر آپ نے اس پر غور کیا تو قوم کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے — مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا) اتنا کہہ کر علامہ بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث کے بعد مجمعے میں شعر خوانی کے لیے اصرار کرنے کی ہمت نہ ہوگی۔

خطبے کے خاتمے کے بعد مولوی یعقوب نے انگریزی سے ناواقف لوگوں کے لیے خطبے کے مرکزی خیالات کو اردو میں پیش کیا لیکن مجمع اکھڑ چکا تھا اور لوگ بے ہنگم طریقے سے باہر جانے لگے۔

اگلے روز اخباروں میں کوئی خاص خبر نہ تھی اور دو ایک میں تھی تو بہت معمولی انداز میں۔ عجیب صورت حال تھی، اخبار والوں کو کیا کہا جائے خود مسلمانوں کے اس جلسے میں علامہ کی موجودگی میں حاضرین کی کمی اور کم فہمی کے سلسلے میں چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں:

"ایسے کھلے ہوئے اشارے اور تصریح کے بعد بھی مسلم لیگ کے اس اجلاس میں موجود کسی ایک فرد نے بھی کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ کسی نے اپنی تقریر میں اس کی تائید میں کوئی تجویز پیش کی اور ہوتی بھی کیسے! کیوں کہ مسلم لیگ تو محض زمینداروں، تعلقہ داروں اور خطاب یافتوں کا ایک سوسائٹی گہوارہ تھا۔ شاید وہ جلسہ بھی اس قابل نہ تھا کہ اس میں وہ جواہر پارے بکھیرے جاتے"۔

ممکن ہے کہ ان تحریروں میں تعصبات پنہاں ہوں لیکن مفتی فخرالاسلام جو اس جلسے میں شریک تھے اور انتظامیہ سے مایوس اور شاکی بھی۔ آخر کار جلسے کے اختتام پر انھوں نے علامہ سے دبے لفظوں میں پوچھا: "آپ ان ٹوپیوں میں کہاں آ پھنسے؟" تو علامہ نے جواب دیا تھا: "تم لوگ گھبراؤ مت، یہ لوگ باقی رہنے والے نہیں لیکن قوم باقی رہے گی"۔

دوسری نشست ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کی صبح علامہ کی صدارت میں ہوئی لیکن یہ کوئی عام جلسہ نہ تھا بلکہ مسلم لیگ کے کارکنان اور انتظامیہ کی مخصوص نشست تھی جس میں کئی تجاویز منظور کی گئیں لیکن مزاج اور روایت کے مطابق ان تجاویز کو پیش کرتے اور 'چالو' خیال کرتے ہوئے بحثیں ہوئیں، تلخیاں بھی ہوئیں۔ ان تلخیوں اور بحثوں کو دیکھتے ہوئے علامہ ایک گھنٹے تک صدارت کرنے کے بعد نشست سے اٹھ گئے۔ ان کی جگہ نواب محمد اسماعیل نے کرسی صدارت سنبھالی۔

عبدالحی عباسی بتاتے ہیں کہ ۲۹ دسمبر کی سہ پہر وہ بیرسٹر ظہور احمد کے ساتھ علاقے میں پیدل گھومنے نکلے تو آس پاس کے لوگوں اور دکان داروں وغیرہ سے ملاقات اور علیک سلیک کی۔ دوسرے دن جسٹس سر شاہ محمد سلیمان نے ان کی ضیافت اور دعوت کرنی چاہی لیکن جلد لاہور واپس جانے کی وجہ سے علامہ معذرت کر گئے البتہ علامہ نے اکبر الٰہ آبادی کے مزار پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مفتی فخرالاسلام انھیں موٹر پر کالا ڈانڈا قبرستان لے گئے جہاں اکبر الٰہ آبادی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ علامہ نے قبر پر فاتحہ پڑھا۔ مختار زمن لکھتے ہیں کہ علامہ نے قبر دیکھ کر بہت افسوس کے ساتھ کہا: "اتنے بڑے آدمی کی قبر اور اس کی یہ حالت"۔ ایک اور صاحب جو کسی اسکول میں اردو کے استاد تھے، نام تھا ریاض الٰہ آبادی، علامہ جب واپس جا رہے تھے تو ریلوے اسٹیشن پر ان سے ملاقات کی۔ ٹرین لیٹ تھی اور علامہ احباب میں گھرے گفتگو میں مصروف تھے۔ ریاض الٰہ آبادی کا خود بیان ہے کہ — "وہ چار صاحبان ان (اقبال) کے گرد کھڑے تھے اور ٹرین کا انتظار تھا جو لیٹ تھی۔ میں نے علامہ اقبال کو سلام کیا اور کہا کہ میں ایک معمولی طالب علم ہوں، بچوں کو پڑھاتا ہوں، ایک اسکول میں ملازم ہوں۔ آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کا مطلب پوچھنا چاہتا ہوں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو یہ کہہ دیتا کہ آپ غلط وقت پر آئے ہیں، مجھے فرصت نہیں ہے مگر علامہ نے انتہائی اخلاق سے میرا ہاتھ پکڑا اور سامنے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں لے گئے، ہم دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے پوچھا "کون سا شعر ہے؟" میں نے عرض کیا:

ہوئی ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

علامہ نے فرمایا — میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قومیں فنا نہیں ہوتیں، اپنا قائم مقام پیش کر دیتی ہیں اور ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے۔ ستارے فنا نہیں ہوتے اپنا قائم مقام سورج کی شکل میں انھوں نے پیش کر دیا جو روشنی میں ستاروں سے برتر ہے۔ پھر انھوں نے تاتاریوں کی تاریخ پر تبصرہ فرمایا۔ اتنے میں ٹرین آ گئی اور وہ رخصت ہو گئے اور میں ان کے پاکیزہ اخلاق کا ایسا گرویدہ ہوا کہ آج تک اس کی یاد تازہ ہے"۔ (ماخوذ)

مندرجہ بالا تحریروں اور بعض دیگر تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کو رخصت کرتے وقت اسٹیشن پر وہ بھیڑ نہ تھی جو ان کی آمد اور استقبال کے وقت تھی۔ حد یہ کہ دو روزہ منزل کے جلسے میں بھی وہ بھیڑ نہ تھی جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بھیڑ تو خیر کیا جلسے میں چند افراد و اشخاص کو چھوڑ کر عام لوگوں کی سماعت میں وہ سنجیدگی اور انہماک نہ تھا جو علامہ کی غیر معمولی شخصیت کے پیش نظر ہونا چاہیے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ندیم شفیق ملک لکھتے ہیں:

"الٰہ آباد میں مسلمانوں کی عمومی حالت نہایت خستہ تھی۔ اکبر الٰہ آبادی کی رحلت کے بعد ان میں کوئی صحیح قومی رہنما موجود نہ تھا۔ ہر چند ایک ڈاکٹر شفاعت احمد خاں تھے مگر وہ بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے لندن گئے ہوئے تھے"۔

ہر چند کہ نواب محمد یوسف اور حاجی غضنفر اللہ وغیرہ تھے اور انھوں نے اپنے اپنے تئیں قیام و طعام کا معقول انتظام بھی کیا لیکن لگتا ہے کہ ان دونوں عمائدین کی ذمہ داری انھیں حدوں تک تھی۔ پھر یہ بھی کہ ان دونوں حضرات کا شمار شہر کے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

اردو میڈیم اقامتی اسکولوں اور کالجوں کی بحالی کی یقین دہانی

تلنگانہ ٹیچرس اردو ایسوسی ایشن کی نائب وزیر اعلیٰ سے نمائندگی

حیدرآباد (۳۰ر جولائی)۔ تلنگانہ ٹیچرس اردو ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری جناب محمد مسعود الدین احمد اور ڈاکٹر اقبال گی الدین کی قیادت میں ایک وفد نے نائب وزیر اعلیٰ جناب محمد محمود علی سے ملاقات کی اور آندھرا اور ریاست تلنگانہ میں قائم اردو اقامتی اسکولوں اور کالجوں سے متعلق تفصیلی معلومات و GO کو پیش کیا اور بتایا کہ کس طرح اردو دشمن عہدیداروں نے پبلک ڈیمانڈ کے نام پر اردو میڈیم اسکولوں کو انگلش میڈیم میں تبدیل کر دیا تاکہ جنرل کالجوں میں غیر مسلم طلبہ کا 50 فیصد داخلہ ممکن ہو سکے اور اسکولوں میں ایس سی ایس ٹی کوٹے بھی 30 فیصد مختص کر دیا گیا کیوں کہ جنرل اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ انٹرنس کی بنیاد پر ہوتا ہے جب کہ مائناریٹی اسکولوں اور کالجوں میں راست داخلے دیے جاتے ہیں۔ نائب وزیر اعلیٰ کو بتایا گیا ہے کہ تعجب اس بات کا ہے کہ جنرل ریسیڈنشل اسکولس 200 سے زائد ہیں اور کئی جنرل کالجس بھی ہیں لیکن اس کے باوجود مائناریٹی اسکولوں اور کالجوں میں اس طرح کا کوٹہ مختص کرنا معنی خیز ہے جس سے اقلیتی طلبہ کا کافی نقصان ہو رہا ہے۔ وفد کی تفصیلات سننے کے بعد نائب وزیر اعلیٰ نے فوری طور پر پرنسپل سکریٹری جناب وکاس راج اور محترمہ شیشو کماری (سکریٹری اے پی آر ای آئی سوسائٹی) سے فون پر ربط پیدا کیا اور ہدایت دی کہ فوری اردو میڈیم اقامتی اسکولوں کو بحال کیا جائے نیز انگلش میڈیم کے متوازی سکشن بھی باقی رکھے جائیں۔ اس کے علاوہ جونیر ریسیڈنشل کالجوں میں اردو اور انگلش میڈیم کو برقرار رکھا جائے اور صرف مسلم اقلیتی طلبہ کو ہی داخلہ دیا جائے۔ انگلش میڈیم اسکولوں اور کالجوں میں کوالیفائڈ اساتذہ کا تقرر کیا جائے تاکہ وہ انگلش میڈیم میں معیاری تعلیم دے سکیں اور جن کا تقرر اردو میڈیم اسکولوں اور کالجوں کے لیے ہوا ہے انھیں انہی اسکولوں اور کالجوں میں متعین کیا جائے۔ جماعت ہفتم تا نہم اور انٹر سال اول میں راست داخلے دیے جائیں۔ نائب وزیر اعلیٰ نے وفد کو اس بات کا بھی یقین دلایا کہ ان مسائل کی عنقریب یکسوئی کی جائے گی اور عنقریب حکم نامہ بھی جاری کر دیا جائے گا۔ تلنگانہ اردو ٹیچرس کے وفد نے نائب وزیر اعلیٰ کی دلچسپی، عہدیداروں کو بروقت ہدایت اور تیقن دینے پر شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ اردو کے ساتھ مکمل انصاف ہوگا۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

اُتر پردیش کے اردو مترجمین میں خوشی کی لہر

مظفر نگر، یوپی (۱۸ر جولائی)۔ طویل عرصے سے عہدے میں ترقی کی امید لیے اردو مترجمین کو اس وقت خوشی کا احساس ہوا جب سرکار نے دوسری ایس سی پی 18 برس کی خدمات پر لگی پابندی کو ہٹا دینے کا اعلان کیا۔ احکام کے مطابق 2013 سے اس کا فائدہ اردو مترجمین کو مل جائے گا۔ یہ جانکاری دیتے ہوئے اردو مترجمین مہا سنگھ کے ضلع صدر محمد مستقیم اور سکریٹری شفیق احمد نے بتایا کہ اتر پردیش سرکار کے جوائنٹ سکریٹری ریا شنکر سنگھ نے اس بارے میں سرکاری احکام جاری کیے ہیں جس میں یہ انتظام رکھا گیا ہے کہ اردو مترجمین اسسٹنٹ جونیر کلرک کو 10 برس کی خدمات کے عوض پہلے اقتصادی ترقی کی شکل میں تنخواہ کا گریڈ 2400 روپے اضافی رہے گا، اس کے بعد پہلی ترقی کے طور پر 15 برس کی مدت ملازمت پوری کرنے پر عہدہ نام دتنخواہ بینڈ صورت میں 5200-20200 روپے اور گریڈ تنخواہ 2800 روپے اضافی ہوگا۔ یہ اس کے لیے پہلی ترقی کے طور پر ہوگا۔ اس میں اس کی تنخواہ مقررہ سرکاری احکام کی گنجائش کے مطابق کیا جائے گا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

طلبہ و طالبات

اردو کی کتابوں سے محروم

اناؤ، اتر پردیش (۲۴ر جون)۔ کئی برس سے پرائمری اور جونیر کلاس میں اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کو اردو کی کتابیں دستیاب نہیں ہوئی ہیں۔ حکومت ہر سال ہندی کی کتابیں وقت پر مہیا تو کرا دیتی ہے لیکن اردو پڑھنے والے بچوں کو بھی وقت پر اردو کی کتابیں مہیا نہیں کرائی جاتی ہیں۔ اسکول میں اردو اساتذہ تو ہیں لیکن ان کے پڑھانے کے لیے اردو کی کتابیں نہیں ہیں اور یہ بھی اساتذہ ہندی یا پھر کوئی دوسرا مضمون پڑھانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مواضعات کا حال تو اور بھی خراب ہے وہاں بچے اردو زبان کو جانتے ہی نہیں ہیں، نہ ہی ان کو اردو کے بارے میں اردو اساتذہ کچھ بتاتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اسکول میں مراٹھی زبان کے استاد

برہانپور، مدھیہ پردیش۔ مدھیہ پردیش کے محکمہ تعلیم کی طرف سے سال 2011-12-13 میں اسکولوں کی ترقی کی گئی تھی جس سے طلبہ کو سہولت ملی تھی لیکن اسکولوں کی ترقی کے ساتھ ہی اساتذہ کی تقرری پر توجہ نہیں دیے جانے سے شہر سمیت دیہی خطوں کے اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کے ساتھ ہی ہندی اسکولوں میں اردو اور مراٹھی کے اساتذہ اور اردو اسکولوں میں مراٹھی اور ہندی زبان کے اساتذہ کی تقرری کیے جانے سے مختلف مسائل پیدا ہو گئے تھے جس کو لے کر سرپنچ اور سکریٹری کی طرف سے محکمہ تعلیم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی لیکن اس جانب توجہ نہیں دیے جانے سے تعلیمی سیشن 2014-15 میں بھی ایسی ہی صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں گرام بروڈا کے سرپنچ اور سکریٹری کے ساتھ علاقے کے لوگوں کی طرف سے اس کی شکایت ضلع کلکٹر اور ضلع تعلیم افسر سے کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ اردو اسکولوں سے مراٹھی زبان کے اساتذہ کو ہٹا کر ان کی جگہ پر اردو زبان کے اساتذہ مقرر کیے جائیں، لیکن ایسا نہیں ہونے سے طالب علم اور والدین پریشان ہیں۔ ضلع انتظامیہ اور محکمہ تعلیم کو چاہیے کہ وہ اس طرف توجہ دے کر نظام میں بہتری لائیں۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

آل انڈیا ریڈیو کی اردو نیوز یونٹ میں رائٹرس پینل کو ختم کر دیا گیا

اخراجات کا بہانہ بنا کر آل انڈیا ریڈیو سے اردو کو ختم کرنے کی اعلا افسران کی سازش

نئی دہلی (۲ر جولائی)۔ مودی سرکار کے آتے ہی اردو کے سلسلے میں کئی تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں، ڈی ڈی اردو تاریخ کے بعد اب جولائی ۲۰۱۴ء سے آل انڈیا ریڈیو کی اردو نیوز سروس میں اردو رائٹروں کے پینل کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ اس سے قبل چند نئی تقرریوں کے بہانے ڈی ڈی اردو میں بھی اردو پینل میں کام کرنے والے اردو مترجمین اور نیوز ریڈروں کو بھی ہٹا دیا گیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اردو رائٹروں کا پینل گزشتہ آٹھ برسوں سے کام کر رہا تھا اور رائٹروں کو اس منتخب پینل کے ذریعے جزوقتی کام کے لیے بلایا جاتا تھا، لیکن گزشتہ ہفتہ اچانک ہی کسی قسم کی تحریری اطلاع دیے بغیر پینل کو ختم کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو کی ڈائرکٹر جنرل نیوز مسز ارچنا دتہ نے 'انقلاب' سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارے یہاں پچھلے دنوں کانٹریکٹ پر تقریباً 12 افراد کی بحالی ہوئی ہے اس لیے ہم نے عارضی طور پر بنائے گئے پینل کو ختم کر دیا ہے۔ پچھلے 15 برسوں سے ہمارے یہاں کوئی بحالی نہیں ہوئی تھی اس لیے اسٹاف کی سخت کمی تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو رائٹرس کے پینل کو ختم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے لیے روزانہ روٹین بنانی پڑتی تھی۔ دوسری طرف پرسار بھارتی کی بھی گائڈ لائن ہے کہ جزوقتی اسٹاف کے بجائے کل وقتی اسٹاف سے کام لیا جائے۔ آل انڈیا ریڈیو میں اسٹاف کی سخت کمی ہے، جو لوگ ریٹائر ہو رہے ہیں ان کی جگہ پر کسی کو بحال نہیں کیا جا رہا ہے۔ کیا اے آئی آر میں اردو کے مستقل اسٹاف کی بحالی کا امکان ہے؟ اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ پرسار بھارتی دیکھتی ہے اور مستقل اسٹاف کی بحالی کی منصوبہ بندی بھی وہیں ہوتی ہے۔ دوسری طرف اردو سروس کے ایک ذمہ دار نے بتایا کہ انھیں اعلا افسران نے ہدایت دی ہے کہ اخراجات کو کم کرنے کے لیے اس پینل کو ختم کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ اردو یونٹ میں اسٹاف کی کمی رہی ہے اور جو لوگ ریٹائر ہوتے ہیں ان پر نئی تقرریاں نہیں کی گئی ہیں اس لیے جزوقتی رائٹروں سے کام لیا جا رہا تھا۔ اردو رائٹروں نے جزوقتی کام سے انھیں بغیر کسی اطلاع کے اچانک ہٹائے جانے پر نہ صرف احتجاج کیا ہے بلکہ اطلاعات نشریات کے وزیر پرکاش جاوڈیکر سے ملاقات کرکے اردو رائٹروں کے مسائل کو اٹھانے کی بات کہی ہے۔ انھوں نے الزام لگایا کہ پرسار بھارتی کے بعض افسران اخراجات کے بہانے اردو دشمنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور مودی سرکار کو بدنام کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر اس فیصلے کو واپس نہیں لیا گیا تو جلد ہی آکاش وانی بھون کے سامنے مظاہرہ کریں گے۔ انھوں نے جاوڈیکر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ جلد از جلد مداخلت کرکے حالات کی اصلیت کو جاننے کی کوشش کریں اور پینل کو بحال کرائیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

نظام آباد کے مالاپلی اردو میڈیم کالج کی منظوری کی یقین دہانی

نظام آباد، تلنگانہ (۱۵ر جون)۔ کے کویتا (ایم پی، ٹی آر ایس نظام آباد) نے کہا کہ ضلع کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ہر ممکن اقدام کیے جائیں گے۔ ضلع نظام آباد کے عوام نے ٹی آر ایس کو صد فیصد کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ضلع کے عوام اور کسانوں کے مسائل کے حل کے لیے چیف منسٹر تلنگانہ کے چندر شیکھر راؤ پابند عہد ہیں۔ کے کویتا بہ حیثیت رکن پارلیمنٹ نظام آباد حلف برداری کے بعد پہلی مرتبہ نظام آباد آمد کے موقع پر پرانی رہائش گاہ پر پریس کانفرنس سے خطاب کر رہی تھیں۔ انھوں نے نظام آباد کے مالاپلی علاقے میں ۲۰۰۸ء میں تعمیر کردہ سرکاری گرلز جونیر کالج اردو میڈیم کی جاریہ سال سے ہی منظوری کے لیے ہر ممکن اقدام کا یقین دلایا اور کہا کہ ۲۰ر جون کو حکومت کی جانب سے کالج کی منظوری کے احکام جاری کیے جائیں گے اور جاریہ ماہ سے ہی داخلوں کا آغاز کیا جائے گا۔ مرکزی تعلیمی اداروں جات کے تحت ضلع کے نظام آباد اور بودھن میں مرکزی اسکولوں کے قیام سے متعلق کے کویتا نے کہا کہ نظام آباد میں مرکزی اسکول کے لیے مختص اراضی غیر موزوں ہے۔ اس اراضی پر سے ہائی ٹینشن تار گزر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ متبادل اراضی کے حصول تک ڈائٹ کالج کی عمارت میں اسکول قائم کیا جائے گا۔ اس موقع پر ایس اے علیم، نوید اقبال، عبدالرحیم سیفی، یٰسین صابری، طارق انصاری، علیم قمر، عمران شہزاد، تجمل شکیب، شاکر اور دوسرے موجود تھے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

کرناٹک میں 11 ہزار پرائمری اسکول ٹیچرس کی تقرری کے لیے منظوری، جس میں صرف پانچ سو اردو اسامیاں شامل

بجاپور، کرناٹک (۲۷ رجولائی)۔ اگست اور ستمبر کے دوران ریاست بھر میں سرکاری پرائمری اسکولوں کے ٹیچرس کے عہدوں کی بھرتی کے لیے سی ای ٹی منعقد کرنے کے لیے تمام تیاریاں جاری ہیں۔ کمشنر برائے تعلیمات عامہ محمد محسن نے نمائندہ سالار کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ریاست میں سرکاری پرائمری اسکولوں کے لیے کل گیارہ ہزار اسامیوں کی بھرتی کے لیے منظوری حاصل ہوئی ہے جب کہ مزید پانچ ہزار اسامیوں کی بھرتی کے لیے گنجائش کا احساس کرتے ہوئے وزیراعلا اور وزیر برائے پرائمری تعلیم سے درخواست باقاعدہ محکمہ تعلیمات عامہ کر چکا ہے اور امید کی جارہی ہے کہ جلد 16 ہزار اسامیوں کی سی ای ٹی کے ذریعے تقرری عمل میں لائی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ مذکورہ اسامیوں کی بھرتی میں صرف پانچ سو اردو کی اسامیاں شامل ہیں، جب کہ ریاست میں جہاں اردو اساتذہ کی ضرورت ہے ان خالی اسامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ڈھائی ہزار اردو ٹیچرس کی بھرتی کے لیے ایک تجویز محکمۂ تعلیمات ریاستی حکومت کی منظوری کے لیے روانہ کر چکا ہے۔ محمد محسن نے اپنی بات کو بڑھاتے ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ بتایا کہ ریاست میں سرکاری پرائمری اردو اسکولوں کی صورت حال بہتر نہیں ہے اور اس طرح کی صورت حال کے لیے والدین اور اساتذۂ کرام کی عدم دل چسپی سے پیدا ہوتی ہے اس لیے اساتذۂ کرام اور والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے فرائض دل چسپی کے ساتھ انجام دیں۔ انھوں نے سرکاری اردو اساتذۂ کرام سے اپیل کی کہ سرکاری اردو اسکولوں میں نئی جان پیدا کرتے ہوئے اردو طلبہ میں اردو کے متعلق پائی جانے والی احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش کریں ورنہ ایک دن ایسا آسکتا ہے کہ صرف اردو اسکول کی عمارتیں نظر آئیں گی مگر اردو کے طلبہ ان میں دکھائی نہیں دیں گے۔

(سالار، بنگلور)

طلبہ کو پڑھانے کے لیے اردو ٹیچر نہیں

میونسپل اسکولوں میں درجہ ایک سے آٹھ تک کے طلبہ کو ان کی مرضی پر پڑھائی جارہی ہے اردو

فتح پور، یوپی (۲۱ رجون)۔ حکومت کے ذریعے میونسپل اسکولوں میں طلبہ کو اردو کی تعلیم دینے کے لیے اسے سلیبس میں شامل تو کر دیا گیا لیکن اردو مضمون کو پڑھائے گا کون؟ یہ بات نہ تو حکومت کو معلوم ہے اور نہ ہی محکمہ کے افسران کو۔ یہ بات دیگر ہے کہ خاص طور پر مسلم طلبہ کی مرضی پر اردو تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد دو ہزار کے آس پاس ہے لیکن جو بھی طالب علم پڑھنے والے ہیں ان کی تیاری کیسے ہوگی۔ شہر حلقہ کے درجن بھر اسکولوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کہیں بھی اردو ٹیچرس کی تعیناتی نہیں کی گئی ہے۔ گزشتہ سیشن سے نافذ کی گئی اردو تعلیم کے لیے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا ہے۔

ضلع کے 13 ترقیاتی بلاکوں کے 786 گاؤں پنچایتوں اور شہری حلقے میں 1902 پرائمری اسکول اور 746 ہائر سیکنڈری اسکول ہیں۔ یہاں 2 لاکھ 65 ہزار سے زائد بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان میں سے 1705 طلبہ ایسے ہیں جو اردو کے لیے خواہاں ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں شروع کی گئی اردو کی پڑھائی طلبہ کیسے کریں گے اس معاملے میں حکومت سنجیدہ نہیں ہے تو محکمۂ تعلیم کے افسران کے پاس بھی کوئی راستہ نہیں ہے۔ دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ اردو مضمون کو بھی درجہ ایک سے 8 تک نافذ کیا گیا ہے۔ ان میں پڑھنے والے طلبہ کی نشان دہی بھی محکمہ کے ذریعے کی گئی ہے۔ اردو کے یہ طلبہ گزشتہ سیشن سے پڑھائی کر رہے ہیں۔

حکومت نے سرکاری اسکولوں میں کانونٹ اسکولوں کی طرز پر ہندی کے ساتھ ساتھ انگریزی مضمون کو فروغ دینے کے لیے سلیبس میں تبدیلی کی ہے۔ اب اردو کو بھی طلبہ تک شروعات سے ہی پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ مضمون لازمی نہیں ہے لیکن میونسپل اسکولوں میں پڑھنے والے زیادہ تر طالب علم اردو مضمون لے رہے ہیں۔

گزشتہ سال سے شروع ہوئی اس کی تدریس میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سلیبس میں بھی تبدیلی کی گئی ہے۔ یکم جولائی سے شروع ہونے والے نئے تعلیمی سیشن کے لیے بلاک تعلیم افسران نے اردو زبان سیکھنے والے طلبہ کی جو تعداد دی ہے وہ 1705 ہے۔ ان میں درجہ ایک میں 187، درجہ 2 میں 242، درجہ 3 میں 230، درجہ 4 میں 237، درجہ 5 میں 200، درجہ 6 میں 208، درجہ 7 میں 198، درجہ 8 میں 205 طلبہ کا رجسٹریشن ہوا ہے۔ انھیں اردو کی تعلیم دی جانی ہے لیکن ٹیچروں کی کمی ہے۔ شہر حلقہ کے تقریباً ایک درجن اسکولوں میں ہی اردو ٹیچر تعینات ہیں۔ باقی اسکولوں میں ٹیچر نہیں ہیں لیکن پورے ضلع کے مختلف اسکولوں میں تقریباً 2 ہزار اردو طلبہ رجسٹرڈ ہیں۔ انھیں اردو سبجیکٹ پڑھانے کا بڑا مسئلہ ہے۔ حاضرین نے کہا کہ وہ محکمہ کے اعلا افسران کو اس مسئلے سے باخبر کریں گے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

آرمور کے اردو میڈیم گورنمنٹ گرلز جونیر کالج میں

سائنس سیکشن کی بقا کو یقینی بنایا جائے

آرمور، آندھرا پردیش (۱۷ رجون)۔ شہر آرمور میں طالبات کے لیے قائم سرکاری جونیر کالج مسلم طالبات کے لیے زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا کئی سال سے واحد ذریعہ رہا ہے۔ اس کالج سے فارغ التحصیل طالبات میں سے کئی پیشۂ تدریس سے وابستہ ہو کر پرسکون زندگی گزار رہی ہیں اور کچھ طالبات دیگر محکموں میں بھی ملازمت حاصل کر چکی ہیں۔ سال ۱۹۹۳ء میں ایچ ای سی اور سی ای سی گروپس کے تحت اردو میڈیم میں طالبات کے داخلوں کا آغاز ہوا اور آغاز کے ساتھ ہی طالبات کی تعداد اور نتائج نہایت حوصلہ افزا رہے۔ گورنمنٹ جونیر کالج فار گرلز آرمور کا اردو میڈیم سیکشن، انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آرمور، بالکنڈہ، موپتاڑ، کمریلی، بابا پور، بھیمگل، بالکنڈہ اور یوچم پاڈ وغیرہ کی اردو میڈیم دسویں جماعت کامیاب طالبات کے لیے واحد ذریعہ ہے۔ مسابقت کے اس زمانے میں اردو میڈیم کی طالبات کا سائنسی میدان میں داخلوں کی اشد ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مرکزی کمیٹی آرمور اور دیگر معزز شخصیات کی نمائندگی پر ۲۰۰۷ء سے اس کالج میں بی پی سی اور ایم پی سی گروپس کا بھی آغاز عمل میں آیا۔ اس وقت کے کمشنر جناب چکراپانی (آئی اے ایس) نے RC No. Acad-1-1/737/2007 مورخہ ۲۸ رجون ۲۰۰۷ء کو اس اردو میڈیم کالج میں آرٹس سکشنس (سی ای سی اور ایچ ای سی گروپس) کے متوازی سائنس سکشنس (بی پی سی اور ایم پی سی گروپس) چلانے کی اجازت دے دی اور اسی سال سے داخلوں کا آغاز بھی ہوگیا، لیکن حکومت نے لکچررس کی اسامیاں منظور نہیں کی، جس کی وجہ سے کالج کے اس سائنس سکشنس کے لیے کوئی بھی گورنمنٹ لکچرر یا کنٹراکٹ لکچرر کا تقرر ابھی تک نہیں ہو پایا۔ شہر آرمور کی نمائندہ انجمن مرکزی کمیٹی تنظیم المسلمین آرمور نے اپنی طرف سے مالی اعانت کرتے ہوئے اردو میڈیم کے بی پی سی اور ایم پی سی گروپس کے لیے لکچررس کا انتظام کیا، لیکن اب یہ انجمن مزید مالی اعانت کرنے کے موقف میں نہیں ہے۔ اس کا راست اثر ایم پی سی گروپ پر گزشتہ سال ہی پڑ چکا ہے اور نتیجے کے طور پر اردو میڈیم کا ایم پی سی سکشن برخاست ہو چکا ہے اور سال رواں بی پی سی گروپ بھی برخاستگی کے دہانے پر آکھڑا ہے۔ اردو میڈیم کی کئی طالبات جو اردو ذریعہ تعلیم سے انٹرمیڈیٹ میں بی پی سی اور ایم پی سی میں داخلہ لینا چاہتی ہیں وہ اور ان کے سرپرست نہایت مایوس ہو چکے ہیں۔ ایسے میں یہ طالبات اور ان کے سرپرست جن میں غریب لوگ زیادہ ہیں وہ ارباب مجاز اور محبان اردو سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس کالج میں لکچررس کے پوسٹ کو منظور کیا جائے اور بی پی سی گروپ کی بقا کو یقینی بناتے ہوئے برخاست شدہ ایم پی سی گروپ کا بھی احیا کیا جائے۔ آرمور کے سوشل ورکر جناب قاسم علی گورے میاں نے ان حالات کو ارباب مجاز کے گوش گزار کرنے کا قدم اٹھایا ہے۔ طالبات اور ان کے سرپرست چاہتے ہیں کہ محبان اردو اور دیگر آگے بڑھ کر شہر آرمور کے مسلمان لڑکیوں کو انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے موجود اس واحد سرکاری جونیر کالج کے سائنس سکشنس کی بقا کو یقینی بنائیں۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

اردو زبان کو ریاست کے تمام اسکولوں میں لازم قرار دیا جائے

اروڑی، تلنگانہ (۲۶ رجون)۔ بدر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اروڑی نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں حکومت تلنگانہ سے مطالبہ کیا گیا کہ ہر اسکول میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے لازم قرار دیا جائے۔ اس موقعے پر سکریٹری بدر ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی قادری صاحب نے کہا کہ اب ریاست تلنگانہ میں اردو کے فروغ و بقا کے لیے ہمیں متحد ہو کر کام کرنا چاہیے۔ بعد ازاں محمد ذاکر نے مطالبہ کیا کہ آنے والے دنوں میں ہماری ریاست کے لیے اردو اکیڈمی کے علاوہ اقلیتی فائنانس کارپوریشن کا قیام حکومت عمل میں لائے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو ریاست کی دوسری زبان کا درجہ دیتے ہوئے ریاست کے تمام سرکاری اور خانگی دفتروں پر اردو میں سائن بورڈ نصب کیے جائیں۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

تلنگانہ اسمبلی میں اردو کو نظر انداز کرنے پر برہمی

فاروق حسین (ایم ایل سی) نے ایوان تلنگانہ قانون ساز کونسل میں ٹی آر ایس کے اختیار کردہ رویے پر اظہار افسوس کیا اور کونسل میں منعقدہ رائے دہی میں استعمال کردہ بیلٹ باکس اور بیلٹ پیپر پر اعتراض کیا اور سکریٹری مقننہ ڈاکٹر راجہ سدا رام کو وزیر امور مقننہ جناب ہریش راؤ کے روبرو طلب کرتے ہوئے اردو کو نظر انداز کرنے پر سخت سرزنش کی۔ فاروق حسین نے کہا کہ اردو تلنگانہ کی سب سے اہم زبان ہے جس کو تلگو کے برابر کا مقام حاصل ہے مگر اس کو نہ بیلٹ پیپر پر اور نہ ہی بیلٹ باکس پر تحریر کیا گیا جس پر سکریٹری نے معذرت خواہی کی اور مستقبل میں اس کا اعادہ نہ ہونے دینے کا وعدہ کیا۔ اس موقعے پر فاروق حسین نے کہا کہ ٹی آر ایس حکومت اردو کو تلگو کے برابر مقام دینے اور محکموں میں اردو مترجمین اور ناصحوں کی اسامیوں پر تقرری کا وعدہ کیا ہے مگر افسوس کہ اس کے خلاف عمل اس جگہ سے ہو رہا ہے جہاں قانون بنتا ہے۔ انھوں نے اسمبلی و کونسل میں فوری طور پر اردو مترجمین، نائب مترجمین، اردو رپورٹرس اور ناصحین وغیرہ کی اسامیوں کو پر کرنے کا مطالبہ کیا۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : فکریے
مصنف : ابن غوری
ضخامت : ۱۵۶ صفحات
قیمت : 90 روپے
ناشر : ابن غوری 11-3-940،
امتیاز ریزیڈنسی، چورایا
نوٹے کی بلی، حیدرآباد-1

تبصرہ نگار: امیر حمزہ
ameerhamzah039@gmail.com

ابن غوری ایک مشہور و معروف قلم کار کا نام ہے، جنھوں نے 'فکر و نظر' کے عنوان سے کئی کالم مختلف اخبارات و رسائل میں لکھا ہے۔ ابن غوری اخبارات و رسائل میں لکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مصنف اور مؤلف ہیں جن کی تالیفات و تصنیفات میں مذہبی موضوعات اور ادبی موضوعات دونوں شامل ہیں۔ جیسے بیت بازی بکلام اقبال موضوعاتی ترتیب، نایاب نعتیں (انتخاب)، اقبال کی نظمیں، اقبال کے تین سو تیرہ اشعار اور مذہبی کتابوں میں فضائل اخلاق واخلاص، قرآن میں کیا ہے، قرآن و حدیث کے تیس سبق وغیرہ اور بھی ان کی کچھ کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ اس سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصنف کس قدر لگے ہوئے قلم کار ہیں۔ وہ صرف اصلاح اخلاق و عادات ہی نہیں بلکہ تعمیر ملت کے حامی و علمبردار ہیں نیز اردو کے فروغ کے لیے انھوں نے پُر اثر انداز میں لوگوں کو ابھارا ہے۔

مصنف کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ زیر تبصرہ کتاب 'فکریے' بھی ہے۔ اس کتاب کا تعارف مجتبیٰ حسین صاحب بہت ہی اچھے انداز میں کرتے ہیں۔ 'فکریے' نہ افسانہ ہے نہ مضامین نہ انشائیے، ان کو محسوسات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایک خالص مذہبی انسان کے محسوسات جو مسلمان کو سچا اور اس دنیا کو اس سے بہتر دیکھنا چاہتا ہے۔ ذکر اللہ، ذکر رسول، صحابہ کرام اور دیگر شخصیات کے واقعات سے منور یہ فکریے ہم کو صرف دعوت فکر ہی نہیں دیتے بلکہ دعوت عمل بھی دیتے ہیں۔"

آپ محسوس کر رہے ہوں گے کہ شاید یہ کتاب مذہبی چادر میں لپٹی ہوئی کتاب ہے، حالاں کہ کتاب میں بہت زیادہ ایسے فکر یا نظر ہیں جو مختلف قوم و ملت سے تعلق رکھنے والوں کے لیے کار آمد اور مفید ہیں۔ جیسا کہ ایک کا عنوان ہے 'جیم اردو' جس میں آپ دیکھیے کہ عام الفاظ میں کیسا متاثر اور جھنجھوڑ دینے والا سبق مصنف دے جاتا ہے۔

"ان محترمہ (شمس النساء، قمر النساء، قمر بانو، نجمہ خانم...) کی اولاد دیکنو میڈیم سے پڑھتی ہے — ایک طمانچہ
اور وہ بھی اسی اسکول میں اردو میڈیم سے پڑھاتی ہیں — دوسرا طمانچہ
اور ان کی مادری زبان بھی اردو ہے — تیسرا طمانچہ
پڑ رہا ہے ہم اردو کے گالوں پر!!!"

اس طرح کے اور بھی بہت سارے فکر و نظر ہیں جو ہم خوابیدہ افراد کے لیے بہت اہم ہیں۔ ابن غوری صاحب نے اس کتاب میں 'فکر و نظر' کے جو عنوانات رکھے ہیں وہ بھی بہت دل چسپ ہیں، عنوان پڑھ کر ہی لگتا ہے کہ اس کو پڑھنا چاہیے۔ جملہ کتاب ۱۴۲ چھوٹے جواہرات سے پُر ہیں، خصوصاً مسلمانوں کے لیے ہر ایک فکر و نظر میں ایک پیغام ہے۔ امید ہے کہ ابن غوری صاحب کی یہ کوشش ان کو ایک مفکر کے طور پر قوم کے سامنے لائے گی اور یہ کتاب اہل نظر کے نزدیک مقبول ہوگی۔

☆☆☆

نام کتاب : نقارہ (ناول)
مصنف : گنٹر گراس
مترجم : باقر نقوی
ضخامت : ۸۰۷ صفحات
قیمت : ۱۴۰۰ روپے
ناشر : اکادمی بازیافت، کتاب مارکیٹ
آفس نمبر ۱۶، اردو بازار
کراچی، پاکستان

تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

۱۹۵۹ء میں جرمن زبان میں لکھا گیا ناول 'نقارہ' (The Tin Drum) گنٹر گراس کا پہلا ناول ہے جسے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ ناول تین ناولوں کے سلسلے Danzig Trilogy کا پہلا حصہ ہے جو ان کی شہرت کو بام عروج پر لے گیا۔ اس کو بنیاد بنا کر ۱۹۷۹ء میں اکادمی ایوارڈ یافتہ فلم بھی بنائی گئی۔ ناول کا ترجمہ ہندوستانی نژاد مترجم کار باقر نقوی نے، جو اب برطانیہ میں اقامت پذیر ہیں، بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیا ہے۔ موصوف ای ایف یو لائف انشورنس کمپنی سے وابستہ ہیں مگر اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے علاوہ ادب، شاعری اور سائنس سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے ('تازہ ہوا'، 'مٹھی بھر تارے'، 'موتی موتی رنگ')، شعری کلیات 'دامن'، افسانوں کا مجموعہ 'آٹھوں رنگ' اور سائنس و نوبل پرائز سے متعلق تصانیف 'الفریڈ نوبل'، 'خلیے کی دنیا'، 'برقیات مع الیکٹرانکس کی مختصر تاریخ'، 'مصنوعی ذہانت'، 'نوبل ادبیات'، 'نوبل امن کے سو برس' اور 'نوبل حیاتیات' منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر ترجمے سے پہلے ان کا ہرٹا میلر کے ناول 'تنفسی سرزمین' کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

ناول 'نقارہ' ایک ذہنی مریض آسکر ماتسیرات، جو ۱۹۵۲ سے ۱۹۵۴ء تک پاگل خانے میں قید رہا، کی خود نوشت کہانی ہے۔ والد کے جبر کے خلاف وہ اپنی جسمانی نشو و نما روک لیتا ہے جبکہ ذہنی طور پر وہ باشعور اور بالغ ہے۔ فطرت نے اسے ایسی طاقت بخشی ہے کہ وہ اپنی چیخ سے بلوریں اشیا کو چکنا چور کر سکتا ہے جو در اصل اس کی روحانی طاقت کا علامیہ ہے۔ وہ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد عملی زندگی جینے پر قناعت کر لیتا ہے اور کئی معاشقوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ تیسرے جنم دن پر اسے ایک نقارہ تحفے میں مل جاتا ہے جسے وہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ آسکر کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کے دو والد ہیں۔ نازی پارٹی کا رکن الفریڈ، جو اس کی ماں کا خاوند ہوتا ہے اور دوسرا ڈانزگ پولینڈ کا باشندہ جان جو وہاں کے ڈاک خانے کو جرمنوں کے حملے سے بچانے کی کوشش میں اپنی جان گنواتا ہے۔ جنگ کے دوران آسکر فوجیوں کی تفریح کے لیے بونوں کی جماعت میں شامل ہوتا ہے مگر جب نورمنڈی کے حملے میں اس کی معشوقہ روزویتا کا اتحادی فوجیوں کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس اپنے گھر چلا جاتا ہے اور وہاں ایک جرائم پیشہ گروپ میں شامل ہو جاتا ہے۔ روس کی بڑھتی ہوئی فوجیں الفریڈ کو گولی سے مار دیتی ہیں۔ انجام کار آسکر، اس کی سوتیلی ماں اور ان کے بیٹے کرٹ کو ڈانزگ چھوڑ کر ڈسلڈارف جانا پڑتا ہے جہاں وہ ماڈلنگ اور سنگ تراشی کا پیشہ اختیار کرتا ہے۔ ان کی آپس میں نہیں بنتی ہے اس لیے وہ الگ سے زیڈلر کے یہاں رہنے لگتا ہے اور وہیں اپنی پڑوسی سسٹر ڈوروتھیا سے عشق لڑاتا ہے جو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا۔ اسی دوران وہ ایک موسیقار کلیپس سے ملتا ہے اور اپنی قسم توڑ کر اس کو اپنے نقارہ بجانے کے ہنر سے آگاہ کرتا ہے۔ نتیجتاً کلیپس، آسکر اور شولے (گٹار بجانے والا) آپس میں دوست بنتے ہیں اور رائن ریور تھری جیز بینڈ کی بنیاد ڈالتے ہیں جس سے متاثر ہو کر شمو ان کو اونین سیلر کلب میں موسیقی کا پروگرام دینے کی دعوت دیتا ہے۔ پروگرام کے دوران میں ایک ریکارڈنگ کمپنی آسکر کے ساتھ قرار کرتی ہے، جس کی بدولت وہ شہرت کی بلندیوں اور دولت کی فراوانی سے سرفراز ہوتا ہے۔ لیکن ایک روز چلتے چلتے وہ سسٹر ڈوروتھیا، جس کا قتل ہو چکا ہوتا ہے، کی کٹی ہوئی انگلی پہچانتا ہے کیوں کہ اس کی پہنائی ہوئی انگوٹھی اس میں ابھی موجود ہوتی ہے۔ وہ ایک دوست وٹلار کی مدد سے قتل کا الزام اپنے سر لیتا ہے اور پھر دماغی حالت خراب ہونے کے سبب پاگل خانے میں داخل کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی خود نوشت لکھتا ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے ناول 'نقارہ' سیاسی ناول ہے، جس کا پس منظر دوسری جنگ عظیم کی تباہی ہے۔ ناول میں عیسائیت، یہودیت اور شیطان کے وجود پر کافی بحث و مباحثہ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں اس پر کفر، عریانیت اور فحش نگاری کے الزام کے باعث لوگوں کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ یہ ناول مقبول عام و خاص ہوا اور نہ صرف جرمنی بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ اسی حوالے سے ترجمہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ انھیں کئی ایسی تفصیلات کو حذف کرنا پڑا جو مذہب اسلام کے منافی تھے۔ نقارہ کا پلاٹ کئی بار زمانی اور مکانی تسلسل کی نفی بھی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ناول کا راوی دماغی طور پر انتشار کا شکار ہے۔ وہ کبھی واقعات کا بیان بطور واحد متکلم پیش کرتا ہے اور کبھی صیغۂ غائب کے طور پر۔ ناول میں تمثیل (allegory)، اسطورہ (Myth) اور قصص و روایات (legend) تینوں کا ہنر مندی سے استعمال کیا گیا ہے جس کے سبب اس ناول کو 'میجک رئلزم' (Magic Realism) کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔

جہاں تک ترجمہ نگاری کا سوال ہے تو باقر نقوی صاحب نے بڑی دقیقہ رسی اور خوش اسلوبی سے یہ کام سر انجام دیا ہے۔ ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہو۔ باقر نقوی کے یہاں یہ وصف صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ترجموں کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ ان سے دنیائے ادب کی بہت ساری کھڑکیاں اردو طلبہ کے لیے کھل جاتی ہیں اور وہ مختلف زبانوں کے لٹریچر سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی یہ ناول بہت ہی اہم ہے۔ امید ہے کہ اس ناول کی اردو حلقوں میں خوب پذیرائی ہوگی۔

○○○

بقیہ: دلیپ کمار کی آپ بیتی

صفحہ ۸ سے آگے

ہے کہ انھوں نے فلم 'آن' میں پریم ناتھ کو منفی رول میں پیش کرنے کی سفارش محبوب خان سے کی تھی اور وہ مشورہ کامیاب ثابت ہوا۔ صاحب کتاب نے انکشاف کیا ہے کہ مشہور کامیڈین مقری ان کے کلاس فیلو تھے۔ دلیپ کمار کی سوانح عمری معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ 25 ابواب پر مشتمل ہے۔ ساری کتاب 450 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ سرورق پر دلیپ کمار کی خوب صورت تصویر ناظرین کو ان کی جانب کھینچتی ہے۔ کتاب میں نادر و نایاب تصویریں ہیں جو یادگار زمانہ ہیں۔ ان تصاویر کے بہت سے لوگ اب اس دنیا میں نہیں ہیں صرف ان کی یادیں باقی ہیں۔ دلیپ کمار کی شادی کی ایک ایسی تصویر بھی ہے جس میں راج کپور ان کے بازو بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نایاب کتاب میں چند فلمی ستاروں کے مشاہدات بھی ہیں۔ سب نے دلیپ کمار کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آخر میں دلیپ کمار کی فلموں کی فہرست دی گئی ہے۔ کتاب کے پہلے ورق پر صاحب تصنیف کے دستخط ہیں۔ یہ کتاب آن لائن ساڑھے پانچ سو روپے میں منگوائی جا سکتی ہے۔ کتاب کی چھپائی شاندار ہے۔ انگریزی سلیس اور رواں دواں ہے۔ یہ بایو گرافی دلیپ کمار کے پرستاروں کے لیے اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔

●○■

بقیہ: اقبال اور الٰہ آباد

صفحہ ۳ سے آگے

معتبر زمین میں ضرور ہوتا تھا لیکن عوام یا عام مسلمانوں پر ان کا زیادہ اثر نہ تھا۔ کم و بیش یہی صورت حاجی سید محمد حسین بیرسٹر کی بھی تھی جو شہر سے دور سول لائنز کے ایک بنگلے میں رہتے تھے اور عام مسلمانوں سے زیادہ ربط ضبط نہ رکھتے تھے۔ مسلم لیگ یوں بھی تعلقہ داروں اور زمین داروں وغیرہ کی تنظیم زیادہ بھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دور جینے لیگ کے رہنماؤں کو محمد حسین کا انتظام زیادہ پسند نہ آیا۔ پھر اچانک کئی مصلحتوں کے تحت جلسہ گاہ کی تبدیلی بھی ایک بڑی وجہ بنی۔ ابتدا میں بتلایا گیا کہ یہ جلسہ اسلامیہ کالج کے میدان میں ہوگا لیکن اس وقت تک لیگ کئی حوالوں سے تنازعات کا حصہ بن چکی تھی اسی لیے، احتیاط کے پیش نظر دوازدہ منزل میں جلسے کا اہتمام کیا گیا جس کے انتظام میں دوازدہ منزل کے مالک رحیم بخش پیش پیش رہے لیکن یہاں بھی معقول انتظام اور ماحول نہ ہونے کی وجہ سے بھی جلسہ متاثر ہوا لیکن یہ سب چھوٹی وجہیں ہیں، اصل وجہ تو یہ تھی کہ مسلمانوں اور بالخصوص الٰہ آباد کے مسلمانوں کے حالات اچھے نہ تھے۔ احمد الدین مارہروی لکھتے ہیں:

''اس وقت سیاسی حالات ایسے تھے کہ قوم نہ تو کسی کو اپنا واحد لیڈر تسلیم کر چکی تھی نہ اسے اپنے قدیم لیڈروں پر اعتماد باقی تھا۔ ان دنوں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس کا کانگریس نے تو بائیکاٹ کر رکھا تھا لیکن مسلمانوں کے تمام سربرآوردہ لیڈر اس میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے۔ ان حالات میں علامہ اقبال کا صدارت کے لیے منتخب کیا جانا بلاشبہ اتفاقی دانش مندی پرمبنی تھا کیوں کہ اول تو وہ عملی طور پر مسلمانوں کی ان جماعتوں سے غیر متعلق تھے جو ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ دوسرے ہر جوان، بوڑھا، بچہ ان کو بہ حیثیت شاعر عزت کی نظر سے دیکھتا اور ان کی عظمت کا دل سے معترف تھا۔ ایک چیز جو ہم نوجوانوں کے لیے ناقابل فہم تھی وہ مقام اجلاس کا انتخاب تھا۔ اکبر مرحوم نے الٰہ آباد کے مسلمانوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں یوں ظاہر کیا:

اب الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے
اور وہاں واقعی مسلمانوں کا کوئی قومی لیڈر تھا ہی نہیں''۔

کچھ ایسا بھی تھا کہ جلسے کے بعد جو تجاویز منظور کی گئیں وہ سب کے سب ایک طے شدہ ذہنیت کی غماز تھیں ان پر علامہ کے خطبے کا کوئی اثر نہ تھا (یہاں تجاویز کا عمل جائزہ لیکن نہیں نہ ہی مضمون کا مقصد ہے) نہ ان کی دور بینی اور ژرف نگاہی کا۔ اسی لیے لطیف احمد شروانی کہتے ہیں:

''قوم کی راہ میں ایک سنگ میل آیا اور گزر گیا مگر اس کی آنکھیں بدستور بند رہیں۔ کان میں صور اسرافیل پھونکا گیا مگر وہ خواب گراں سے بیدار نہ ہوئی۔ مفکر اعظم نے صراط مستقیم کی طرف اس کی رہنمائی کی لیکن وہ پھر بھی گم کردہ راہ ہی رہی''۔

(اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین، ص ۳۸۵)

بلکہ اس کے برعکس تقسیم کے دیوانوں اور ہجرت پسند مسلمانوں نے اس خطبے کو بنیاد پاکستان یا تصور پاکستان یا تقسیم ہند کی شروعات وغیرہ وغیرہ کے نام دے گئے جب کہ یہ پورا سچ نہیں ہے اور اس کی نفی علامہ نے بھی بعض سوال کے جواب میں کی ہے۔ ۱۳ مارچ ۱۹۳۴ء کو ایڈورڈ تھامسن کو ایک خط میں لکھا:

''آپ مجھے اس اسکیم کا مجوز قرار دیتے ہیں جو پاکستان کے نام سے موسوم ہے حالاں کہ پاکستان میری اسکیم نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبے میں جو اسکیم پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبے کے قیام کی تھی۔ یہ نیا صوبہ میری اسکیم کے تحت مجوزہ ہندوستانی فیڈریشن کا ایک حصہ ہوگا''۔

آل احمد سرور نے بھی ایک جگہ لکھا ہے:

''اقبال نے ۱۹۳۰ء میں شمال میں مغربی صوبوں کو ایک ریاست بنانے پر زور دیا۔ ان کا ہندوستان کے اندر مسلم ہندوستان کا یہ تصور نعرۂ پاکستان سے بالکل مختلف چیز ہے''۔

کہنا یہ ہے کہ اقبال کو پاکستان کا خالق کہنا درست نہیں، لیکن قوم اور لیگ اس وقت ایک دوسرے جذبے اور جوش میں تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ علامہ کے تعلق سے ہم آج بھی اس دھند اور مغالطے سے باہر نہیں نکل پائے ہیں۔

اس مضمون کو لکھتے وقت اور دوازدہ منزل کی تصویریں لینے کی غرض سے میں اپنے ایک مہمان دوست شاعر باقر نقوی (پروفیسر سید محمد عقیل کے بھانجے) جو اصلاً الٰہ آباد کے ہی ہیں لیکن اب پاکستان اور لندن میں رہتے ہیں، ان کے ساتھ دوازدہ منزل گیا تو وہاں کی خستگی اور گندگی ناقابل دید تھی۔ منزل کا پھاٹک دائیں، عارضی قسم کی دکانوں، خوانچوں اور ٹھیلوں کی بھیڑ میں گھرا ہوا، بجلی کے تاروں میں پھنسا ہوا تھا۔ پھاٹک کی پیشانی پر دوازدہ منزل اب بھی کندہ ہے لیکن سب اس سے بے خبر اور بے حال، اور پھاٹک حال سے بے خبر اپنے ماضی کی پُردرد داستان سنا رہا تھا۔ پھاٹک کے اندر کونے میں ایک عورت پتھر کا کوئلہ بیچ رہی تھی جس کے ٹکڑے اور سیاہی پھاٹک کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف لکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں، صفائی نام کو نہ تھی۔ ہم دونوں اندر کی طرف صحن میں گئے تو صحن کی حالت بھی ابتر ہی تھی۔ بہت سارے دروازے، کچھ بند، کچھ کھلے، کچھ ٹوٹے، کچھ پر بوسیدہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف بالو کا ڈھیر، دوسری طرف لکڑی کا ڈھیر اور نہ جانے کیا کیا۔ قوم کے نوجوان کہ جن کے لیے علامہ نے بھی کہا تھا:

وہ دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے، ضعیفوں سے محبت کرنا

خود غربی اور اندھیرے کی انتہاؤں کو پار کرتے ہوئے معیشت و معاشرت کی دلدوز کہانیاں سنا رہے تھے۔ باقر صاحب نے کئی زاویوں سے تصویریں لیں۔ کچھ نوجوان ہمارے پاس آئے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور اس منزل کا بھی تعارف کرایا۔ وہ سب کے سب اس کی اہمیت اور تاریخیت سے ناواقف اور بے خبر تھے۔ جلسے کا تفصیل کر اتنا بولے ''جی شہادت کا بیان تو یہاں آج بھی ہوتا ہے۔ میلاد ہوتے ہیں۔ کل آٹھ محرم ہے، عشاء کے بعد ہوگا آپ لوگ بھی آیئے''۔ پھر نیتاً ایک بزرگ شخص دکھائی دیے علیک سلیک کے بعد میں نے ان سے بھی اس تاریخی جگہ کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے ''جی میں جانتا ہوں، پاکستان کی بنیاد یہیں پڑی تھی۔ یہیں پر سب کچھ طے ہوا تھا''۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نہ جانتے تھے۔ مجھے بھی زیادہ حیرانی نہ ہوئی کہ علامہ کے خطبے کو لے کر جب پڑھے لکھے لوگوں میں غلط فہمی ہے تو ان معصوم لوگوں کا کیا۔

دوسرے دن شب میں (آٹھ محرم کی شب) باقر نقوی، فخرالکریم اور راقم الحروف جب دوبارہ دوازدہ منزل پہنچے تو نسبتاً صفائی تھی اور روشنی تھی، اندر صحن میں بھی صفائی تھی۔ شامیانہ تنا ہوا تھا کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور سامنے اسٹیج بھی تھا جہاں سے شہادت کا بیان ہوتا تھا۔ رحیم بخش کے دو پوتے ہم سے ملنے آئے (جن سے میں تھوڑا بہت واقف تھا اور وہ بھی مجھ سے شناسا تھے، شناسائی کا حوالہ دائرہ شاہ محمدی کے نائب سجادہ نشین اور شاعر شاہ محمود احمد رمز تھے جو میرے اچھے دوست ہیں) میں نے ان سے بھی عرض کیا ''آپ تو اس کی تاریخی اہمیت سے واقف ہوں گے؟ اس جگہ علامہ اقبال آئے تھے۔ کیا آپ کے پاس یا آپ کے خاندان کے پاس اس زمانے کی کوئی تحریر یا تصویر ہے؟'' جی! ہمارے پاس بڑے بڑے تبرکات ہیں''۔ ان میں سے ایک بولے۔ شاید وہ میری باتوں کو کچھ اور سمجھے، لیکن میں سمجھ گیا کہ شاہ محمود رمز کے دوست ہونے اور ان کے آستانے پر حاضری دینے کی وجہ سے وہ معاملے کو سید ھے طور پر عقیدت مندی اور ارادت مندی کی طرف لے گئے کیوں کہ یہ خاندان ہمیشہ سے ہی صوفی خانوادوں سے بہت قریب رہا ہے۔ شہادت کے بیان میں ابھی تاخیر تھی۔ ہم نے دوازدہ منزل کی کچھ اور تصویریں کھینچیں اور حسرت سے اس کے صحن، پھاٹک اور پھاٹک پر کندہ دوازدہ منزل کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ اکثر آگے بڑھ جانا ہی ماضی کے کرب و درد سے چھٹکارا پانے کی سبیل ہوتی ہے اور مبہم ماضی سے مستحکم حال کا سفر طے کرنے کی دلیل بھی۔

الٰہ آباد سے واپسی کے بعد علامہ آٹھ سال تک زندہ رہے۔ آخری کے چند برس اگرچہ شدید بیماری میں گزرے تاہم مسلمانوں کی سلامتی، بہبودی کی فکر تادم آخر رہی۔ یہ ایک فطری عمل تھا کہ وہ خود ایک سچے مسلمان تھے لیکن ان کے فکر و خیال کو محض مسلمانوں تک محدود کرنا بھی مناسب نہیں کہ علامہ صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کو سلامت اور خوش حال دیکھنا چاہتے تھے اور اسی خواہش کو لیے ہوئے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اسی حال نئے سال کی آمد کے موقع پر پہلی جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو سے علامہ کا جو پیغام نشر ہوا، اسی تحریر پر میں اس مقالے کو ختم کرتا ہوں۔ علامہ نے فرمایا:

''جب تک انسان اپنے اعمال کے ذریعے یہ مظاہرہ نہیں کرتے کہ ان کے عقیدے کے مطابق ساری دنیا خداوند تعالیٰ کا ایک واحد خاندان ہے، جب تک نسل، رنگ اور علاقائی قومیتوں کے امتیازات قطعی طور پر مٹا نہیں دیے جاتے، اس دنیا میں انسانوں کو کبھی خوشی، مسرت اور اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہو سکے گی۔ مساوات اور اخوت کے حسین تخیل کو کبھی بھی حقیقت کا جامہ نہ پہنایا جا سکے گا۔ پس ہمیں نئے سال کی ابتدا اس دعا سے کرنی چاہیے کہ خداوند کریم دنیا کے حاکموں کو انسانیت اور نوع انسانی کی محبت عطا فرمائے''۔

خیال رہے کہ اس پیغام میں علامہ نے انسان اور ساری دنیا کو مخاطب کر کے اپنی بات کہی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ۱۹۳۰ء کے خطبے کو بھی اسی تناظر میں لیا جاتا اور علامہ کے وسیع نقطہ نظر کو محدود و مشروط کر کے نہ دیکھا گیا ہوتا۔ کچھ فیصلے وقت کی ضرورت کے مطابق جذباتی عوام اپنے حق میں کر لیتے ہیں اور کچھ فیصلے آنے والا وقت کرتا ہے۔ باقی — باقی رہے نام اللہ کا۔

ماخذ:

- 'دانشورِ اقبال'، آل احمد سرور
- 'علامہ اقبال کا سفر الٰہ آباد'، ندیم شفیق ملک
- 'دوازدہ منزل سے منزل پاکستان تک'، مختار زمن
- 'علامہ اقبال الٰہ آباد میں'، رحیم بخش شاہین

○○○

شہرۂ آفاق اداکار دلیپ کمار کی آپ بیتی

حقیقت اور پرچھائیاں --- ایک طائرانہ نظر

ڈاکٹر مسعود جعفری (8-1-43/1/A/5، پوسٹ آفس شیخ پیٹ، حیدرآباد- 500 008)

ہندوستانی سنیما کے لافانی اداکار دلیپ کمار نے پچھلے سات دہوں میں پردۂ سیمیں پر اپنی اداکاری کے گہرے نقوش ثبت کیے۔ انھوں نے اپنے فن سے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ سلور جوبلی ستارے دیو آنند اور شاہ رخ خان کے بعد قدرت کی اس انمول ہستی نے اپنی بایوگرافی کے موتیوں کو اوراقِ سادہ پر بکھیر دیا ہے۔ اسے فلمی صحافی اودے تارا نائر نے تحریر کیا ہے۔ دلیپ کمار اپنے حالاتِ زندگی شستہ اردو میں بولتے چلے گئے، جسے ٹیپ کیا جاتا رہا۔ مختلف نشستوں میں یہ کام انجام دیا جاتا رہا۔ 2004 سے اس کا آغاز ہوا۔ اودے تارا نے شہنشاہِ جذبات کے رومانی، شاعرانہ اور جمالیاتی فصیح و بلیغ تاثرات کو تقی احمد کی مدد سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ سلسلہ ابتدا سے انتہا تک چلتا رہا۔ اپنی سوانح کو دوسروں سے قلم بند کروانا کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا تجربہ شیخ عبداللہ اور قتیل شفائی نے کیا ہے۔ دونوں کی کتابیں 'آتشِ چنار' اور 'گھنگرو ٹوٹ گئے' کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ دلیپ کمار اپنی والدہ کو اماں اور والد کو آغا جی بلاتے ہیں۔ انھوں نے کتاب کو والدین کے نام معنون کرتے ہوئے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے:

سکونِ دل کے لیے کچھ تو اہتمام کروں
ذرا نظر جو ملے پھر انھیں سلام کروں
مجھے تو ہوش نہیں آپ مشورہ دیجے
کہاں سے چھیڑوں فسانہ کہاں تمام کروں

ان محبت و نور میں ڈوبے ہوئے اشعار سے دلیپ کمار کی اپنے ماں باپ سے بے پناہ محبت و مروت کا پتا چلتا ہے۔ انھیں اپنے والد محمد سرور خاں اور والدہ عائشہ بیگم سے غیر معمولی انسیت رہی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں کو بھی ٹوٹ کے پیار کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بہنوں کی دیکھ بھال، کفالت، تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں کی۔ بڑی بہن سکینہ آپا بجرو ہی رہیں۔ انھوں نے چھوٹی بہن اختر کو لندن میں تعلیم دلوائی۔ اختر سے بہت ہی توقعات تھیں لیکن جب انھوں نے اپنے سے دوگنی عمر والے ہدایت کار کے۔ آصف سے شادی کرلی تو دلیپ کمار کو بہت رنج ہوا۔ وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انھوں نے مغلِ اعظم کے پریمیر شو میں شرکت سے انکار کردیا۔ وہ بڑے ہی حساس ہیں۔ ان کی حساس طبیعت کا اندازہ ان کی فلم کی ہیروئن کامنی کوشل کی سرد مہری اور تعلقات کے ٹوٹنے پر ہوتا ہے۔ مشہور رقاصہ ستارہ کے بیان کے مطابق دلیپ کمار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بے حد غمگین تھے۔ کامنی کوشل کے بھائی نے ان سے فون پر کہا تھا کہ وہ ان سے کبھی نہیں ملے گی۔ وہ اس سے بات کرنے یا ملاقات کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کامنی کوشل کی بے وفائی سے دلیپ کمار بکھر گئے تھے۔ اسی طرح مدھوبالا اور اس کے باپ عطاء اللہ کے ناروا سلوک سے بھی ان کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ وہ مدھوبالا سے شادی کے متمنی تھے۔ عطاء اللہ چاہتے تھے کہ شادی کے بعد دلیپ کمار ان کے گھر میں رہیں۔ مدھوبالا بھی اپنے باپ کی طرف داری کرتی تھی۔ یہ باہمی کشاکش اس وقت بامِ عروج پر پہنچی جب مدھوبالا کو فلم 'نیا دور' سے باہر کردیا گیا۔ معاملہ کورٹ کچہری تک گیا۔ عطاء اللہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آؤٹ ڈور شوٹنگ کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ فلم کے ڈائرکٹر بی آر چوپڑا نے زچ ہوکر مدھوبالا کو فلم سے نکال دیا۔ دلیپ کمار نے کہا ہے کہ مدھوبالا کے فلم سے اخراج میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اس واقعے کے ذمہ دار باپ بیٹی تھے۔ مدھوبالا سے راہ و رسم ختم ہوجانے کے بعد دلیپ کمار نے چین کا سانس لیا۔ تاہم ان پر انھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر صادق آتا ہے:

اسیرِ دردِ محبت جیا تو کیا جیا
ہے ایک سانس کا جھگڑا لیا لیا نہ لیا

دلیپ صاحب نے اپنے روحانی کرب کو غالب کے الفاظ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

انھوں نے فلم ذات کو علم دنیا میں شامل کرلیا ہے۔ ان کی متفکرانہ سوچ اور متلاشی نگاہیں رازہائے فطرت کو بے نقاب کرنے کے لیے مضطرب رہتی ہیں۔ ان کا مزاج اوس کھلے پھول کی مانند رہا۔ انھوں نے خود کو منکشف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خود بین و خود نگر کے ساتھ خود آگاہ بھی رہے۔ ان کے شرمیلے پن کو راج کپور نے دور کرنے کی کوشش کی۔ جب دیویکا رانی نے انھیں اسٹوڈیو میں بارہ سو پچاس روپے مشاہرے پر ملازمت دی تو وہ خوشی سے پھولے جارہے تھے۔ گھر آنے کے بعد ان کے بھائی ایوب خاں نے سوال کیا کہ بارہ سو پچاس سالانہ ہیں یا مہینہ تو دلیپ پریشان ہوگئے۔ جب دیویکا رانی نے فون پر کہا کہ وہ ماہانہ تنخواہ ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔ دلیپ کمار کو کے آصف نے فلم 'انار کلی' میں اس لیے نہیں لیا کہ وہ بہت دبلے پتلے ہیں۔ وہ شہزادے سلیم کے رول کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ اور ان کی بیوی دلیپ کمار کی پرکشش قد و قامت کی مداح ہوگئے۔ دلیپ پشاور سے بمبئی آئے تھے۔ اپنی پہلی فلم 'جوار بھاٹا' میں وہ صرف بیس برس کے تھے۔ وہ پشتو، اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی کی تحریر و تقریر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا ذوقِ شاعری، داستان گوئی اور موسیقی بہت صاف ستھرا ہے۔ ان کی یادداشت میں محلے کی کہانیاں اور قصے محفوظ ہیں۔ انھیں سب کچھ لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ دلیپ کمار کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فلموں سے زور و شور سے مکالمے ادا کرنے کے چلن کا خاتمہ کیا اور بمبئی کی فلموں کو پارسی تھیٹر کے اثرات سے چھٹکارا دلوایا۔ دلیپ کمار کی سوانح عمری میں ایک عہد، ایک تہذیب زندہ و تابندہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک سیاسی و سماجی دانشور بھی ہیں۔ وہ صفِ اول کے جہدکار بھی رہے۔ وہ نہرو سے متاثر رہے۔ نہرو بھی ان کے مداح تھے۔ کتاب میں ایک ایسی نایاب تصویر دی گئی ہے جس میں پنڈت نہرو دلیپ کمار کا ہاتھ بڑے ہی پیار سے تھامے آگے قدم بڑھا رہے ہیں۔ نہرو کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر تبسم رقصاں ہے۔ دلیپ کمار کی سماجی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، جن کا احاطہ کتاب میں کیا گیا ہے۔ دلیپ کمار برفانی سرحدوں میں فوجیوں کا دل بہلا رہے تھے کہ کڑاکے کی سردی میں محمد رفیع کی طبیعت خراب ہوگئی اور ان کی آواز بیٹھ گئی تو دلیپ کمار نے انھیں دلاسہ دیا۔ رفیع کو گرم پانی میں شہد گھول کر پلایا جاتا رہا۔ صبح تک ان کی آواز لوٹ آئی تو وہ دلیپ کے ممنون و شکر گزار ہوئے۔ تاحیات وہ دلیپ کی دردمندی و خدا ترسی کے معترف رہے۔ دلیپ کمار نے ایک باب 'خاتون میری زندگی میں' کے عنوان سے مختص کیا ہے۔ انھوں نے سائرہ کو مشرقی و مغربی قدروں کا آئینہ دار لکھا ہے۔ دلیپ کمار نے فلم رام اور شیام میں محمود کے کہنے پر ممتاز کو منتخب کیا تو سائرہ چراغ پا ہوگئیں۔ سلام کلام بند کردیا اور سرد جنگ چھیڑ دی۔ دلیپ کمار نے محسوس کیا کہ سائرہ اب بچی نہیں رہی تو انھوں نے ان کی جانب توجہ کی اور آخرکار ۱۹۶۶ء میں شادی کرلی۔ دلیپ کمار نے پری چہرہ نسیم بانو کے گھر میں ہونے والی ایک ایسی نغمہ ریز محفل کا ذکر کیا ہے جس میں دیو آنند، راجندر کمار، بھیّے خاں اور بھیجو کمار کے علاوہ دیگر ستارے موجود تھے۔ وہ ایک یادگار تقریب تھی۔ دلیپ کمار نے پران سے اپنی دوستی کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ پران نے ہر اچھے اداکار کے لیے دلیپ کمار کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسرے لوگ ان کے ایسے ایکٹ کی حمایت کرتے تھے۔ دلیپ کمار نے لکھ

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ـــ (ادارہ)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org